یعنی

اعلیٰ حضرت ہز اگزالٹیڈ ہائی نس آصف جاہ جہاں پناہ ظل اللہ سپہ سالار مظفر الممالک نظام الملک

سر عثمان علی خاں بہادر فتح جنگ یار وفادار سلطنت برطانیہ جی سی ایس آئی

جی سی بی ای دام ملکہم و سلطنتہم

موجودہ فرماں روائے دکن کے عہد حکومت پر مختصر ریویو اور بعض متعصب

مضمون نگاروں کے غلط بیانات کی تردید

جس کو

خاکسار نظامی بدایونی مالک و ایڈیٹر اخبار ذوالقرنین بدایوں

نے لکھا

سنہ ۱۳۴۲ھ ۱۹۲۳ء

مطبوعہ نظامی پریس بدایوں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بیسویں صدی کی تاریخ دانی اور اخبار نویسی پر بدنما داغ

دورِ حاضرہ میں ہندوستان کا مطلع مہیب اور ہولناک تعصّبات کے بادلوں سے گھرا ہوا ہے۔ ہندو سنگٹھن کی زبردست ہوائیں اور شدھی کی پرشور لہریں دونوں مل جل کر ہر گوشۂ ملک میں تباہ کن تلاطم برپا کر رہی ہیں۔ گستاخ اور دریدہ دہن اخبارات کی صدائے ننگ ہنگام ہندو سوسائیٹی میں گونج گونج کر طوفانی تھپیڑے کی طرح اُن چٹانوں کو ٹکرا رہی ہے جن کی طاقت اندرونی عناد اور بیرونی عداوتوں کے جذبات کو دبانے میں کارگر ثابت ہو چکی ہے۔ تلخ بیان ہندو لیڈروں کی تقریریں پلیٹ فارم پر سیلاب کا درجہ حاصل کرتی جاتی ہیں۔ جھ
اور تراشے ہوئے الزامات۔ دل خراش فقرے، اس کی

کے ساز و سامان کو گھاس اور تنکوں کی طرح بہائے لئے جاتے ہیں
چوہا تا گاندھی کے عالم خیال میں فولادی زنجیروں کی بندشوں
سے بھی نہ ٹوٹ سکتا تھا۔ شورش پسند مضمون نگار جن کا دل
خود غرضانہ خیالات سے اٹا ہوا ہے اپنے قلم سے جھوٹ اور
افترا پردازی کا سمندر بہا کر ہندوستانیوں کی جیتی جاگتی آرزوؤں
کو اس طرح ڈبو رہے ہیں کہ وہ دوبارہ نہیں ابھر سکتیں اور
ان کے نامۂ اعمال کی سیاہی صحایف کے صفحوں پر ڈراؤنی رات
کی طرح چھائی ہوئی ہے ہندوستان ہر زمانے میں راست گو
مورخوں کی قدر کرتا ہوا چلا آیا ہے اور یورپ کے مہذب ممالک
میں فلسفۂ تاریخ کو دیگر علوم سے اسی واسطے اہم خیال کیا جاتا
کہ ایک لایق مورخ جب کسی ضروری مضمون پہ قلم اٹھاتا ہے
تو واقعات پر روشنی ڈالنے میں صحت اور ایمانداری کو ہاتھ
سے نہیں جانے دیتا۔ گورنمنٹ ہند ان بدنام کن اخبارات کے
رویہ کو ہمیشہ غور کی نگاہ سے دیکھتی رہی ہے جو دیسی ریاستوں
میں "بھیک کے ٹکڑے" کے نام سے مشہور ہیں اور جو حملہ آوری
کی فضائے بسیط میں اپنا کرۂ ہوائی قایم کر کے روشن چاند کی
طرح جگمگانے والی صداقت پہ خاک ڈالنے کی کوشش کرتے
رہتے ہیں اور وہ والیان ملک کو ناجائز طور پر دبا کر ذاتی فایدہ
حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں انھیں مدنظر رکھ کر حکومت ہند

بند کرنے کے واسطے گزشتہ سال پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی میں ایک مسودہ قانون
پیش کیا گیا تھا جس پر ہندوستانی ممبران مجلس وضع قوانین و آئین
کی طرف سے بہت کچھ اختلاف کی صدائیں بلند کی گئی تھیں اور اس
قانون کو غیر ضروری بتایا گیا تھا لیکن حضور والیسرائے ہند نے اس کی
منظوری دیدی تھی۔ افسوس کہ تمام شاہد و مورخ اور غلط نگار اخبار نویس
اپنے برتاؤ سے آج اس قانون کی ضرورت کو ثابت کر رہے ہیں۔
پچھلے دنوں لاہور سے انگریزی اخبار ٹریبیون نے یہ خبر شائع کی تھی کہ "اعلیٰحضرت
تاجدار دکن عنقریب اپنی حکومت سے علیحدہ ہونے والے ہیں" اس
دل شکن خبر نے اُن حلقوں میں غم و غصہ کے جذبات پیدا کر دیئے تھے
جن کو اس ہمائی اور تفرقہ بازی کے زمانہ میں ہندو اخبارات کے رکیک
اور من گھڑت الزامات کا جو والی ریاست اور رئیس پر آئے دن
لگایا کرتے ہیں پڑھنے کا موقع ملا ہے۔ حضور بندگان عالی کی ذات نہ صرف
اسلامی ممالک بلکہ تمام ہندوستان کے قالب کی روح اعظم سمجھی
جاتی ہے اگر نظام کی سرکاری تار کے ذریعہ سے اس خبر کی تردید نہ
ہو جاتی تو شاید اسلامی حالات کا لحاظ سے نتیجہ وخیم ہو جاتا اور اس کی
ذمہ داری اس قسم کے مضامین شائع کرنے والے ہندو اخبارات پر عائد ہوگی اخبار ٹریبیون کے
اس شائع کردہ سے پہلے بھی یہ مثال ہے کہ اپنے سلسلہ مضامین کے جو مدراس کے اخبار
ہندو میں نکلا تھا اس امر کی ایک مثال قائم کر چکے تھے کہ ہندو
کو اعلیٰحضرت شہریار دکن سے للہی بغض ہے۔

سنت نہال سنگھ کا تعارف سنت نہال سنگھ ایک سکھ انشا پرداز ہیں جن کی آنکھیں یورپ کی جلوہ گاہ سے منوّر ہو چکی ہیں اور وہاں کے تمدن اور طرز معاشرت کا نقشہ ان کے صفحۂ دل پر کھنچ چکا ہے ہندوستان کی خانگی زندگی اور یہاں کی کہنہ رسوم آپ کی مہذب روح کے لیئے زہر کی خاصیت رکھتے ہیں اس لیئے آپ نے ولایت کی ایک لیڈی کو اپنی بیوی بنایا ہے۔ یورپ کے جرائد و رسائل میں آپ کی سحر نگاریوں کی دھوم ہے جس کی وجہ شاید یہ ہے کہ غریب ہندوستان کے رسم و رواج کا مذاق اُڑایا جاتا ہے "سنت" گورمکھی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی حق شناس اور خدا آگاہ ہیں مگر آپ نے اخبار ہند و مدراس کے صفحات پر جو معرفت کے جواہرات بکھیرے ہیں وہ آپ کی ناحق شناسی اور ملکی دنیا داری کا نمونہ ہیں ہمیں یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ آپ حیدرآباد کے صیغۂ تاریخ میں ایسی تنخواہ پر ملازم رہ چکے ہیں جو بڑے بڑے عہدہ داروں کو بھی نصیب نہ تھی آپ خوبصورت پرفضا بنگلہ میں رہتے تھے اور ایک شاندار موٹر میں بیٹھ کر دونوں وقت ہوائیں کھاتے پھرتے تھے۔ سکھ قوم نے انگریزوں کی ملازمت میں جو قیمتی خدمات انجام دیئے ہیں وہ ہندی حکومت کی تاریخ میں ضرب المثل بن گئے ہیں آج تک سکھ اخبارات اپنی نمک حلالی اور وفاداری کے افسانوں کو دُہرا کر خیر خواہی کی فہرست میں صورت اوّلیں کا مرتبہ حاصل کرنا چاہتے ہیں مگر سنت صاحب نے جیسے تیز و تند خیالات جو زہر اُگلا ہے وہ احساس حق کے اس قدر منافی ہے

کہ کوئی سنت۔ کوئی خدا دوست شخص خواہ وہ کسی مذہب کا کیوں نہ ہو
اپنے حرکات و سکنات سے ایسا عجیب و غریب کرشمہ نہیں دکھا سکتا جو
نہال سنگھ کی محسن کش طبیعت سے سرزد ہوا ہے اگر یورپ کی آب وہوا
میں یہ اثر ہے کہ وہ اچھے خاصے روحانی سنتوں کو مادہ پرستی کا دلدادہ بناکر
انہیں حرص و آز کی رسیوں میں جکڑ دیتی ہے تو ہم تمام گوردواروں
سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ "سنت" جیسے متبرک خطاب یا لقب کی حفاظت
میں مصروف ہوں۔ تعجب ہے کہ سنت صاحب نے کشمیر، پٹیالہ، نابھ جیسی
ریاستوں کی بد انتظامیوں کے رازہائے سربستہ کے انکشاف کو چھوڑ کر اُس
اسلامی ریاست پر پہلا وار کیا ہے جس نے ان کو قدردانی کے آسمان
پر پہنچا کر چمکتا ہوا ستارا بنا دیا۔ ریاست میسور کے حالات پر بھی آپ
نے کوئی سلسلہ مضامین نہ نکالا باوجودیکہ یہاں کی تاریخ لکھنے پر جس کو
آپ نے خود جاکر پیش کیا تھا ریاست سے بجائے انعام اکرام کے جواب
خشک ملا پھر بھی اس ریاست سے خفا ہو کر آپ کے قلم کو جنبش نہ
ہوئی شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اس کا فرماں روا مسلمان نہ تھا۔ ریاست
حیدرآباد نے جو اسلامی ریاست تھی آپ کی کافی سے زیادہ مہمانداری
کی جس میں ۱۵ ہزار کے قریب روپیہ کا صرف ہوتا کہا جاتا ہے اور ۲۵
ہزار بطور معاوضہ تاریخ نویسی دیا۔ اس رقم پر آپ نے اضافہ چاہا اور
اس اضافہ کی نامنظوری پر آپ کا جذبہ انتقام بھڑک اٹھا اور یہ خیال
ہوا کہ یہ نامنظوری صیغہ فنانس کی رپورٹ پر ہوئی جس کی وجہ سے آپ نے

صدرالمہام فنانس مسٹر حیدری (نواب حیدر نواز جنگ) پر اپنے مضامین میں خاص عنایت کا برتاؤ کیا کہاں حیدرآباد کی ملکی و مالی حالت کا تبصرہ اور کہاں سر علی امام اور حیدری صاحب کے پرائیوٹ تماشے اور سیلون (ریلوے کا مخصوص ڈبہ) کے ساز و سامان و سجنے سجانے کا تذکرہ۔ اس طرزِ تحریر سے جو انھوں نے حیدر نواز جنگ کے متعلق اختیار کی ہے ان کی افتادِ طبیعت کا پتہ چلتا ہے اور جس سے ان کے تمام مضامین کی نوعیت بھی سمجھ میں آجاتی ہے۔

گر خدا خواہد کہ پردہ کس درد
میلش اندر طعنۂ پاکاں برد

یا اردو شاعری کی زبان میں یوں کہنا چاہیے

تیری رسوائی کے خونِ شہدا درپے ہے
دامنِ یار خدا ڈھانپ لے پردہ تیرا

مصنف ہی کو معلوم ہونا چاہیے کہ ریاست حیدرآباد کی حکومت کی رواداری آپ جیسے تنگ دل مورخ کے اعتراف کی محتاج نہیں ہے بلکہ اس امر واقعہ کو کہ یہاں ہر مذہب اور ہر قوم کے حقوق کی نگہداشت ہو سکتی ہے اور یہ ریاست اپنی روایات قدیمہ کو اب تک مضبوطی سے پکڑے ہوئے ہے اور وہ ہندو مسلم اتحاد کا سرچشمہ ہے۔ ہر عہد کے انشا پرداز، مقرر، مورخ، شاعر اظہار کرتے چلے آئے ہیں۔ ہندوستان کے مشہور جادو بیان سخن طراز حضرت داغ دہلوی فرماتے ہیں:-

نیو ڈراستی ایسا ہو کہ ان پر ایک داغ
بل نہیں رکھتے مسلمان سے ہندو دل میں

مسٹر ای کلاڈ کیمبل نے جو یورپ میں علم تاریخ کے ماہر اور کامل تسلیم کیئے گئے ہیں اپنی تاریخ گلیمپسز آف دی نظامس ڈومینین

"Glimpes of the Nizam's Dominian"

میں مذاہب کے باب میں حیدرآباد کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اُس کا مفہوم یہ ہے کہ "ہندوستان کی تمام اسلامی اور ہندو ریاستوں کے مقابلہ میں اس بات کا سہرا حیدرآباد کے سر ہے کہ وہاں مختلف مذاہب کے ساتھ رواداری اور بے تعصبی کا برتاؤ کیا جاتا ہے (جس سے یورپ کے ممالک کو نایاب سبق لینا چاہیئے) کیونکہ نظام کی حکومت جملہ مذاہب کے ساتھ حقیقی معنوں میں یکساں فیاضی اور کشادہ دلی کو برتتی ہے اور وہ اس بات کی ضمانت کرتی ہے کہ مذہبی آزادی میں کسی قسم کی مداخلت نہ کی جائے اور غیر مذاہب والوں کا رونگٹا بھی میلا نہ ہونے پائے۔ جاگیر۔ انعام۔ زمینیں۔ سالانہ عطیات۔ اس کے علاوہ کثیر رقموں کے ذریعہ مختلف طریقوں سے مختلف مذاہب کی امداد ہوتی ہے مندروں اور دیولوں کی محافظت کے لیئے اس طرح روپیہ اور زمینیں دی جاتی ہیں جس طرح مساجد اور درگاہوں کے لیئے مندرجہ بالا تمہیدی سطور پڑھنے کے بعد [illegible] کے سلسلۂ مضامین کی علت غائی سمجھ میں آجاتی ہے کہ [illegible]

ہندوؤں میں بغض و عداوت کی روح پھونک کر انھیں آئندہ مادی فوائد یا دماغی روشنی سے محروم رکھنا تھا

علی گڑھ کالج پر غصہ

جسے بیشہ جماعتوں کی آنکھوں میں علی گڈھ کالج کی مہتم بالشان ہستی ہمیشہ خار کی طرح کھٹکتی رہی ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ مدرسۃ العلوم کے وجود میں آنے سے پہلے اغیار ہی ملک کی اعلیٰ ملازمتوں وغیرہ پر قابض و دخیل تھے مسلمان خواب فراموش کے دلفریب نظارہ میں مصروف ہو کر اپنے مستقبل سے بے خبر تھے۔ سرسید اعظم نے تنگ دل ہندوؤں اور دیگر غیر مسلم تاریک خیال اشخاص کے نزدیک یہ بڑا گناہ کیا کہ مسلمانوں کو غفلت کی نیند سے جگادیا اور نغمہ تعلیم سے مسلمانانِ ہند میں نئی روح پھونک کر انگریزی حکومت میں ان کو ہر قسم کی ملکی ترقی کا حصہ دار بنادیا اور جدید خیالات کی روشنی میں اُنھیں اپنے گزشتہ اقبال کی ایک ہلکی سی جھلک نظر آنے لگی۔ اگر خدا نخواستہ علی گڑھ کالج عالمِ وجود میں نہ آتا اور مسلمان بوریا نشینی کو خیرباد کہہ کر انگریزی تعلیم سے بہرہ یاب نہ ہوتے تو سنت جی کو آج حیدرآباد میں علی گڈھ کالج کے تعلیم یافتہ اصحاب کو دیکھ کر غصہ نہ آتا۔ ریاست حیدرآباد اور علی گڈھ کالج کا تعلق ایسا ہے جیسا روح اور جسم کا اگر اوّل الذکر ہندوستانی مسلمانوں کے لیے کعبۂ مقصد ہے تو آخر الذکر مرکز کو مدینۃ القوم ہونے کا فخر حاصل ہے۔ نہال سنگھ صاحب تحریر فرماتے ہیں "ایک دن جبکہ میں اپنے

دوست سے جو ریاست حیدرآباد کا ایک بڑا مشہور افسر ہے باتیں کر رہا تھا تو میرے دل میں اتفاقیہ یہ خیال آیا کہ میں اُس سے دریافت کروں کہ اس کے کتنے ہم جولی یعنی علی گڑھ اینگلو اورینٹل کالج کے (جس کو اب مسلم یونیورسٹی کہتے ہیں) اولڈ بوائے ایسے ہیں جو نظام حیدرآباد کی ریاست میں اعلیٰ عہدوں پر ممتاز ہیں۔ اس کے جواب میں میرے دوست نے مجھ کو ایک لمبی چوڑی فہرست دکھائی جس میں علی گڈھ کالج کے تعلیم یافتوں کا نام درج تھا جس کو دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ ریاست حیدرآباد کی کونسل کا جو ممبر خزانہ ہے وہ علی گڑھ کا گریجویٹ نہیں ہے مگر علی گڑھ یونیورسٹی کی تعلیمی کونسل کا ممبر ہے۔ محکمۂ خزانہ کا سکریٹری ایک گریجویٹ نوجوان ہے محکمۂ طبابت کا جو سکریٹری ہے وہ اُس مشہور نواب کا متبنیٰ ہے جو کئی سال تک علی گڑھ یونیورسٹی کا مشہور رکن رہا ہے۔ محکمۂ سررشتہ تعلیم کا ڈائرکٹر کالج مذکورہ کے بانی کا پوتا ہے۔ عثمانیہ یونیورسٹی کالج کا پرنسپل علی گڑھ اورینٹل کالج کا طالب علم ہے۔ تقریباً سو فی صدی نظام حیدرآباد کی ریاست کے عہدہ داران مسلمان ہیں اور یہ وہی لوگ ہیں جنھوں نے مسلم یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کی ہے" سنت صاحب ایک اسلامی ریاست میں طلبائے علی گڑھ کے اجتماع سے نہایت پریشان نظر آتے ہیں شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اس طبقہ کو حکومت اور سلطنت کی وفاداری اور اطاعت کی تعلیم خاص طور پر دی گئی ہے۔ ان کی موجودگی میں نہ کوئی پولیٹیکل ایجی ٹیشن کامیاب ہو سکتا ہے اور نہ کوئی غیر آئینی تحریک سرسبز ہو سکتی ہے۔ سنت جی کے مضمون میں مسٹر راس مسعود صاحب ناظم تعلیمات ممالک محروسہ کا پتہ جس طریقے سے

دیا گیا تو اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ علی گڑھ کالج کے تمام اولڈ بوائے عہدہ دار
تھے ایک طرف مسٹر بانی کالج کے پوتے کی موجودگی سب سے زیادہ ناگوار تھی
مسٹر راس مسعود کے دادا نے مسلمانوں کی قسمت کو پستی سے اٹھا کر بلندی پر
پہنچایا۔ دکن کے علاوہ اس وقت ہندوستانی مسلمانوں میں جو قابل قدر
مثالیں دکھائی دیتی ہیں وہ علی گڑھ کالج اور سر سید اعظم کی جانفشاں کوششوں
کے ثمرات ہیں جنھوں نے غیر اقوام کے مقابلہ میں اعلیٰ فتوحات حاصل کی ہیں
گورنمنٹ برطانیہ کی وفاداری میں ریاست حیدرآباد اور علی گڑھ دونوں مشترک الخیال
ہیں جب کبھی سلطنت کو مشکلات پیش آتی ہیں تو دونوں کا رخ قطب نما کی
طرح امداد کی جانب پھرا ہوا ہوتا ہے جس طرح کلائیو کو یہ فخر تھا کہ اس نے ہندوستان
میں انگریزی سلطنت کی بنیاد قایم کی اسی طرح ان دونوں کو حکومت کی بنیاد
مستحکم کرنے کا فخر حاصل ہے یہ وہ مقدس فرشتے ہیں جو نازک موقعوں
پر امن کا ہاتھ دراز کر کے امن کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور ان کی آواز
سے شور و شر کے فتنے زمین میں دھنس جاتے ہیں۔ ریاست اور کالج دونوں
کے خیالات کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ وہاں مسلمانوں کو امن کی
جائز تعلیم دی جاتی ہے اور ان کے دل پر نقش بٹھایا جاتا ہے کہ شور و شر میں
حصہ لینا احکام اسلامی کے خلاف ہے۔ دشمنان اسلام ان دونوں کو اچھی نگاہ
سے نہیں دیکھتے اور ان کی ہستی کو اپنے واسطے افغانستان اور ایران سے بھی
زیادہ خطرناک سمجھتے ہیں۔ یہ غلط الزام ہے کہ ریاست حیدرآباد کے عہدہ داروں
میں غیر مسلموں سے مساوی برتاؤ نہیں کیا جاتا۔ ایک واقعہ تو کتنا [illegible]

تاریخ کے اوراق شہادت دیتے ہیں کہ شاہان دکن ہمیشہ اپنے جانشینوں کو یہ نصیحت کرتے رہے ہیں کہ "شبانہ روز اپنے نفس کا محاسبہ کیا جائے لوگوں کی حقوق تلفی نہ کی جائے اور مروت کا لحاظ رکھا جائے" دولت آصفیہ کے بانی غفران مآب آصف جاہ اول جن کی شجاعت اور بہادری کو دنیا کے تمام مورخ تسلیم کرتے ہیں انھوں نے ۱۱۳۳ھ میں دکن کو فتح کیا تھا۔ اس زمانہ سے اب تک ہندوؤں کے ساتھ مراعات کی جاتی ہیں اور ایک مبصر ہندو مسلمانوں کو یک جان دو قالب دیکھ کر اس بات کا اقرار کرتا ہے کہ اگر مساوات اور جمہوریت کی سچی تصویر کہیں موجود ہے تو وہ دکن کی سرزمین پر ہے جہاں دو سو پانچ سال سے ابتک اتحاد کے شاندار نظارے نظر آتے ہیں اور اگر ایک مسلمان کے دل میں درد اٹھتا ہے تو تمام ہندو اس کی آواز میں شریک ہو جاتے ہیں۔ دکن کے صلح کل اور غیر متعصب فرماں روا دونوں قوموں کو سلطنت کی گاڑی کے دو پہیے سمجھتے رہے ہیں اور نظام حکومت میں دونوں کو برابر کے حصے دیئے گئے ہیں زمانہ حاضرہ میں جو ہندو رئیس۔ امیر، تعلقدار۔ راجہ موجود ہیں ان کے آبا و اجداد نواب آصف جاہ کے ساتھ دکن میں آئے تھے جن کو لاکھوں روپیہ کی جاگیریں اور مناصب دیئے گئے اور وہ عہد ماضیہ سے ابتک اعلیٰ خدمات پر سرافراز کیے جاتے ہیں اور نسلاً بعد نسلاً ان کے اعزاز کا خیال رکھا جاتا ہے۔ یمین السلطنت مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر جو پیشکاری کی موروثی خدمت پر مامور اور تقریباً آٹھ لاکھ روپیہ کی جاگیر کے مالک ہیں ان کا نام سول لسٹ میں صدر اعظم کے نام سے پہلے درج ہوتا ہے

جونے تعصبی کی ایک روشن مثال ہے۔ صرف خاص کا سارا انتظام ایک ہندو عہدہ دار کے ہاتھ میں ہے۔ مہاراجہ نریندر پرشاد اور مہاراجہ چندو لال کی وزارتیں تاریخ آصفیہ میں ہندو مسلم اتحاد کا نشان دیتی ہیں رائے رایان راجہ شیو راج دھرم ونت بہادر اور راجا راؤ بہادر کے خاندان کی عظیم الشان جاگیریں صاف بتا رہی ہیں کہ ریاست حیدرآباد مذہبی تعصب سے پاک صاف ہے۔ اگر سنت صاحب الصاف کی عینک اپنی آنکھوں پر چڑھا کر دیکھیں تو انھیں دکن کے راجوں کی فہرست میں یہ نام نظر آئینگے۔

مہاراجہ صاحب گدوال۔ مہاراجہ صاحب جٹ پول۔ مہاراجہ صاحب ونپرتی۔ راجہ صاحب اناگندی۔ راجہ صاحب ڈوم کنڈہ۔ راجہ صاحب پیٹ۔ راجہ صاحب سرنا پلی۔

ان کے سوا دکن کے ہر گوشہ میں بہت سے ہندو ہیں جو سرچشمۂ ریاست کی فیاضی سے سیراب ہو رہے ہیں اور انھیں لاکھوں روپیہ کی جاگیریں دی گئی ہیں۔ پھر جاگیرداروں کی "دیہی قومی حکومت" ایک ایسی شاندار چیز ہے جو انھیں ترقی کے اعلیٰ زینہ پر پہنچا کر ہندوستان کے قدیم تمدن کی نگہبانی کر رہی ہے۔ سنت صاحب نے دنیائے تعصب کا بہادر کپتان بن کر ریاست کی سول لسٹ کو اپنا نشانہ بنانا چاہا ہے۔ اگر ریاست میں قومی تفریق کا شبہ بھی موجود ہوتا تو ایک غیر مسلم کو صدر اعظم کا عہدہ نہ دیا جاتا جن کی بابت مضمون نگار صاحب نے یہ لکھا ہے کہ "آنریبل نواب فریدوں ملک بہادر ایک پارسی جنٹلمین ہیں جو اردو زبان اچھی طرح سیکھ گئے ہیں اور ہر جمعہ کو مسلمانوں کی جماعت میں

کی وضع میں کچھ بھی فرق نہیں ہوتا قریب قریب تمام دفاتر کے اہلکار بلا لحاظ ہندو مسلم شیروانی اور دفتری دستاریں ملبوس نظر آتے ہیں۔ اور دفتر سے باہر ہندو ترکی ٹوپی بھی پہنتے ہیں وہ یکسانیت ہے جس سے دکن میں ہندو مسلم کے باہمی اتحاد کا پتا چلتا ہے۔

تعلیمی وظائف کے متعلق سنت جی کا اعتراض

سنت جی کہتے ہیں کہ یورپ میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے جو وظیفے دیئے جاتے ہیں ان میں ہندوؤں کو بہت کم حصہ ملتا ہے آپ نے اپنی یادپر زور دیکر ان وظائف کا تناسب ایک اور دس کا بتایا ہے، محکمہ تعلیمات سرکار عالی کی رپورٹیں شاہد ہیں کہ ہندو طلبا کی تعداد مدارس میں مسلمانوں کی بہ نسبت کم رہتی ہے اس کی وجہ ظاہر ہے کہ ہندو اپنے اُن موروثی پیشوں کی وجہ سے جو آمدنی کے لحاظ سے ملازمت سے بدرجہا فوقیت رکھتے ہیں عموماً تعلیم کو ضروری نہیں سمجھتے اور بچوں کو مدرسہ میں بھیجنے کی جگہ ابتدائی عمر سے موروثی پیشہ میں لگا دیتے ہیں جب ملکی تعلیم میں جو آسانی سے حاصل کی جاسکتی ہے ہندوؤں کی یہ حالت ہے تو سمندر پار جاکر اور خاصکر ایسی حالت میں جبکہ چھوت چھات کا مسئلہ جزو مذہب ہو وہ تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے اپنے بچوں کو یورپ کیوں بھیجنا پسند کرینگے۔ گزشتہ ۱۷ سال میں جس قدر درخواستیں یورپی وظایف کے لیے محکمہ سرکار کو موصول ہوئیں اس میں ہندوؤں کی تعداد کا اوسط ⅓ سے کم تھا البتہ اگر صرف تین چار سال گزشتہ کا اوسط لگایا جائے تو ۳۳ فی صدی کا اوسط ہوجاتا ہے۔ چونکہ ان وظایف کے پانے والے طلبا بھی جب وہ ولایت سے

فارغ التحصیل ہو کر آتے ہیں دکن میں اعلیٰ عہدوں پر ممتاز کیے جاتے ہیں اس
لیے حصول وظایف کی فہرست میں ہنود کا مذکورہ بالا تناسب معلوم ہو جانے
کے بعد صرف یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ وظایف کی مد میں اہل ہنود کی تعداد کا کم
ہونا اعلیٰ حضرت تاجدار دکن خلد اللہ ملکہ کے تعصب اور ہندو مسلم تفرقہ کے سبب
نہیں ہے بلکہ خود ہندوؤں کی بے پروائی اور ان کی پابندی مذہب اس کا باعث
ہے اسی کے ساتھ یہ معمہ بھی حل ہو جاتا ہے کہ اعلیٰ عہدوں پر ہندو کیوں کم تعداد
میں ممتاز ہیں۔ جب وظایف کے متعلق بھی سنت جی کا اعتراض رفع ہو جاتا ہے
تو ہمارے اس خیال کو پوری تقویت ہوتی ہے کہ سنت جی کے مضامین کی اشاعت
کا مقصد ریاست کی اصلاح نہ تھا بلکہ اپنے انتقام پسند طبیعت کی جولانی کا دکھانا
منظور تھا۔

علامہ ابن خلدون کے نزدیک ہر واقعہ کی ایک خاص طبیعت ہوتی
ہے کسی مضمون پر نقد و تبصرہ کرنے والا شخص غور و خوض کی مدد سے طبیعت کو پا جاتا ہے
مگر سنت جی صاحب جنہوں نے ریاست حیدرآباد کو بدنام کرنے کا بیڑہ اٹھا لیا
ہے ان کو تعصب کی طوفانی آندھی میں تعداد وظایف میں ہندوؤں کی کمی تو
نظر آئی لیکن انھوں نے یہ کھوج نہ لگایا کہ ہندو والدین کا اپنے بچوں کو تعلیم کے
لیے ولایت بھیجنے کے متعلق عموماً کیا خیال ہے جس گروہ میں علم کی طرف سے عام
بدشوقی ہو اُس کو وظایف کی ترغیب کبھی تعلیم کی خاطر ہندستان سے باہر بحری سفر پر
آمادہ نہیں کر سکتی۔ عہد حاضرہ میں دنیا کی قومیں ترقی کی جولانگاہ میں قدم اٹھا
رہی ہیں لیکن حیدرآباد کے خوش حال ہندو اسی پرانی لکیر کے فقیر ہیں اور ہندوستان سے

ہندوؤں کی طرح مذہب سے آزاد ہوکر دنیوی ترقی کو ضروری نہیں سمجھتے اور ریاست نے اُن کو حق دے رکھا ہے کہ وہ بلاتفریق مذہب و ملت ریاست کی سہولتوں سے بہرہ مند ہونے کی کوشش نہیں کرتے تو اس میں حکومت کا کیا قصور ہے۔

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم
چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

اورنگ زیب ثانی سنت جی اعلیٰ حضرت پر تعصب کا الزام لگاتے ہوئے یہ لکھتے ہیں کہ میں نے ریاست حیدرآباد میں دیکھا۔ یہ سارا معاملہ ایک مولوی صاحب کی تعلیم کا نتیجہ ہے جنہوں نے حضور کو اسلام کی تعلیم دی تھی اور آپ اس وقت بالکل بچے تھے۔ آپ کے دماغ میں ابھی کسی قسم کا کوئی اثر نہ تھا۔ مولوی صاحب کو موقعہ ہاتھ آگیا اور آج جو ہم دیکھتے ہیں یہ مولوی صاحب کی تعلیم کا نتیجہ ہے۔ یعنی وہ اسلامی بیج جس کو مولوی صاحب نے اپنے ہاتھوں ریاست حیدرآباد کی زمین میں بویا تھا آج صرف بڑا نہیں ہوگیا بلکہ ثمردار بھی ہے اور وہ میٹھا پھل لایا ہے جس کی بدولت ریاست کے سیکڑوں اور ہزاروں مسلمان عیش کر رہے ہیں بیان کیا گیا ہے کہ اس مولوی نے متعدد بار قسم کھا کر یہ الفاظ استعمال کیے تھے کہ "میں نے اورنگ زیب ثانی پیدا کر دیا ہے" میں نے ایک دفعہ نظام سے یہ عرض کر دیا تھا کہ آپ صرف مسلمانوں ہی کے آقا نہیں بلکہ ان تمام ہندوؤں اور سکھوں کے بھی مالک ہیں جو آپ کے جھنڈے تلے پرورش پا رہے ہیں۔"

تاہم ہمارا مورخ مضمون نگار صاحب کا یہ اعتراض اسلامی تاریخ کی قلیل واقفیت پر مبنی ہے۔ اسلام کا پہلا اصول یہ ہے کہ بادشاہ وہی جو مسلمان۔

عیسائی، سکھ وغیرہ سب رعایا کے ساتھ یکساں برتاؤ کرے۔ آنحضرت پختہ
مسلمان ہیں اور وہ اس نکتہ کو اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ مذہب انسانوں کو باہمی
محبت سکھاتا ہے۔ جو شخص اپنے مذہب میں پختہ ہے وہ تمام مخلوق کو پیار کرتا ہے اور
سچی انسانیت کی تعلیم دیتا ہے۔ بیشک اورنگ زیب اپنے مذہب میں نہایت پکا
تھا مگر برادران وطن متعصب انگریزی مورخوں کے اقتباسات کو پڑھ کر جو نتیجے
نکال رہے ہیں اس کو دورِ موجودہ کی تاریخی دریافت ماننے کے واسطے تیار نہیں
ہے۔ جدید تحقیقات نے اس مسئلہ کو بخوبی صاف کر دیا ہے کہ اورنگ زیب کی
حکومت عدل و انصاف کے حدود سے باہر نہ تھی اور اس نے اپنے زمانہ میں
قوموں کی آزادی کو دن دونی رات چوگنی ترقی دی۔ ہندوستان کے دیگر
مسلمان بادشاہوں نے جو مراعات دیگر قوموں کے ساتھ برتی ہیں وہ سب
اورنگ زیب سے پیچھے ہیں۔ اس وقت جو لوگ اورنگ زیب کے مظالم کا
افسانہ نمک مرچ لگا کر بیان کرتے ہیں وہ ایک تاریخی غلطی میں مبتلا ہیں۔ یورپ
کا مشہور مورخ لین پول رقم طراز ہے کہ اورنگ زیب کے پچاس برس کی دراز
حکومت میں ایک ظالمانہ فعل بھی اس کے خلاف ثابت نہیں ہوتا اور ہندو
پر حکومت کرنے میں نہ اس نے قتل کیا اور نہ کسی کو جسمانی تکلیف پہنچائی۔ ایک
آزاد نگار یورپین مورخ کا یہ بیان ان لوگوں کے لیے تازیانہ سے کم نہیں ہے
جو اورنگ زیب کی سیاسی قابلیت کے نیلے داغ مرقع میں مخالفت کا رنگ
کوٹ کوٹ کر بھر دیتے ہیں اور اس کی تصویر کو خونخوار بنا کر تاریخی دنیا کے
سامنے پیش کرتے ہیں۔ اورنگ زیب کے متعلق یہ واقعات جو مشہور ہیں کہ

اس نے دکن کی ریاستوں کو مٹا دیا۔ ہندوؤں پر طرح طرح کے قہر ڈھائے۔
بت خانوں کو مسمار کیا مرہٹوں کو چھیڑ کر سلطنت کی بنیادیں ہلا دیں۔ یہ تمام
حالات اُن مورخوں کی من گھڑت ہیں جو ہندوستان کی دو قوموں کے بین
منافرت پھیلانی چاہتے ہیں اور تعصب کی خراب اور برباد کن عنصر نے ان
روایات کو ہر عہد میں تازہ کرتا رہا ہے۔ الین پول ایک دوسرے موقع پر تحریر
کرتا ہے کہ اورنگ زیب نے دنیا کی راہ اپنی ایمانی طاقت سے مسدود کر دی تھی
اُس نے اپنے ادائے فرض کی راہ نکالی تھی۔ اس نے اپنی روح کو مجبور نہیں کیا
اور علم عقائد کو پیٹھ نہ دکھائی۔ ہندوستان کا شہنشاہ اعظم ایسے مادہ کا شخص تھا
جس کے سر پر شہنشاہی کا تاج زیب دیتا تھا، گو مہاراجہ جسونت سنگھ کے بیٹے
کو اورنگ زیب نے قید کیا تھا مگر اس کے لڑکے اور ماں کا خیمہ خیمہ شاہی کے ساتھ
ساتھ استادہ کیا گیا تھا جب سنبھاجی پسر سیواجی شاہی دربار میں آیا اور اس
نے کھانا ترک کر دیا تو اورنگ زیب کی طرف سے یہ پیغام پہنچایا گیا کہ تم قید
میں نہیں بلکہ اپنے گھر میں ہو اس لیئے تم کو نے تکلف کھانا چاہیئے۔ رحم اور
انصاف کی ایسی مثالیں اُسی حکمراں کی ذات میں مل سکتی ہیں جو اپنے مذہب
کا سختی سے پابند ہو اور انسانی حقوق کا لحاظ رکھتا ہے۔

شہنشاہ اورنگ زیب نے مساجد اور خانقاہوں کے ساتھ ہنود کے
بے شمار مندروں کو امداد عطا فرمائی ہے جس کا ذکر روشن خیال اور بے تعصب
ہندوؤں کی تصانیف اور شاہنشاہ مذکور کے دستخطی فرمانوں میں موجود ہے۔ اگر
اعلیٰ حضرت شہریار دکن کے دست راست واقعی ایسا کہا ہے کہ "میں اورنگ زیب

ثانی پیدا کرکے چھوڑونگا، تو انھوں نے اورنگ زیب کے مذکورہ بالا اوصاف کو مدنظر رکھ کر کہا ہوگا ان کے سامنے متعصب ہندوؤں والا اورنگ زیب ہرگز نہیں ہو سکتا اس لیئے اورنگ زیب کا نمونہ گرداننے کے قول کو اگر صحیح بھی مان لیا جائے تو اعلیٰ حضرت کے اُستاد کی نیت ہرگز نہیں ہوسکتی کہ وہ ان کو تعصب اورتنگ دلی کی تعلیم دیں۔ اور ہندوؤں کے برخلاف جذبات کو برافروختہ کریں بلکہ ان کا دلی مقصد یہ ہوگا کہ وہ اورنگ زیب کی فیاضی اور مذہبی پابندی کی نظیریں پیش کرکے شاہی دل میں ایسے خیالات پیدا کریں جو تمام رعایا کے لیئے کامیابی اور ترقی کی راہ نکالیں سنت جی تاریخ دانی کے مدعی ہوکر بھی اورنگ زیب کی بابت خواب پریشان دیکھ رہے ہیں اور نھیں آج تک یہ علم نہیں ہوکہ غیر مسلم ماہرین علم تاریخ نے بھی اب برسوں کی ورق گردانی کے بعد جس طرح یہ طے کرلیا ہو کہ مسلمانوں پر کتب خانہ اسکندریہ کے جلادینے کا الزام غلط ہو اسی طرح اورنگ زیب کے متعلق جو الزامات گھڑے گئے ہیں ان کی قلعی بھی کھل چکی ہو۔ اورنگزیب نے ہندوؤں کے مندروں کو جس قدر جاگیریں دی تھیں وہ اب تک دکن میں ہندوؤں کے پیشوایان دین کی معاش کا ذریعہ بنی ہوئی ہیں اگر اعلیٰ حضرت شہریار دکن نے بھی اسی طرح اسلامی مساجد اور اسلامی خانقاہوں کے علاوہ دیولوں کو نقود اور اراضیات کے عطایا منظور فرمائے ہیں اورنگ زیب کی تقلید کی تو ایسے اورنگ زیب کا خطاب ان کے لیئے کیوں نا موزوں خیال کیا جاسکتا ہو اعلیٰ حضرت کی عطیات صرف ان ہی میں محدود نہیں ہیں بلکہ علاقہ سرکار عالی کے مدارس کے پجاری۔ برہمن وغیرہ بھی

اس زمانہ میں بھی یہ شکایت ہیں۔ علاقہ انگریزی کے واقع مدراس کے مشہور تیرتھ بھدراچلم کی یاترا کے انتظامات اعلیٰ ریاست کی جانب سے ہوتے ہیں اور اس کام کے لیے تقریباً ۱۰ ہزار روپیہ سالانہ کی رقم عنایت ہوتی ہے۔ صرف خاص میں سے بھی تقریباً ایک ہزار اہل ہنود کے تہوار کا سامان کیا جاتا ہے۔ جاگیرداروں کی سالانہ آمدنی کئی ہزار تک پہنچ گئی ہے جن میں جاگیرداران مذہبی کی تعداد تقریباً پچاس بتائی جاتی ہے۔ کیا ان حالات کی موجودگی میں کوئی شخص کی جرات کر سکتا ہے کہ ریاست حیدرآباد میں ہندو مسلم کی تفریق موجود ہے۔ مشہور مورخ ابن خلدون نے چند روز مراکش میں قیام پذیر ہوکر وہاں کے باشندوں کو اپنا شیدائی بنا لیا تھا مگر اس کے برخلاف ہم یہ دیکھتے ہیں کہ آج حیدرآباد بابا سنت نہال سنگھ کی افتراپردازیوں سے متنفر ہوکر انھیں بری طرح یاد کر رہی اور دکنی باشندوں کی جانب سے ان کی تردید میں طول طویل مضامین نکل رہے ہیں۔ مورخین کی تحریر کو خدا نے یہ طاقت دی ہے کہ وہ اپنے قلم کے ذریعہ سے شورشوں کو رفع کر دیتے ہیں لیکن سنت جی حیدرآباد کے ہندوؤں کو جادہ مستقیم سے ہٹا کر انھیں ایک غلط راستے پر لیجانے کے لیے کوشاں ہیں۔ حیدرآباد کی ہندو رعایا ایسی ناسمجھ نہیں ہے کہ وہ ان کی رہنمائی کو قبول کرے بلکہ ممالک محروسہ کے ہندو بزرگوں میں ایسی مقدس ہستیاں پائی جاتی ہیں جو حتی الامکان عوام ہندوؤں میں اس فاسد مادے کو نہ پنپنے دیں گے۔

ریاست حیدرآباد میں مختلف مذاہب کی آبادی

فی الحقیقت حیدرآباد میں مختلف مذاہب رکھنے والے آباد ہیں اور حکومت بلا تفریق مذہب اسی طرح

اسی طرح سنت جی صاحب کا احسان فراموش قلم آئیں بائیں شائیں باتیں لکھ کر تاریخ دانی کی اہانت کر رہا ہے کاش ان کو یہ معلوم ہوتا کہ دکن کی رعایا کا ہندو حصہ زیادہ تر زراعت و دیگر زر افشاں پیشوں میں مصروف ہے یعنی ۹۰ فی صدی ہندو کاشتکار ہیں اور تاجروں کا شمار خاص بلدہ میں ۹۰ اور اضلاع میں ۹۹ فی صد ہے۔ اور اس لیے ہندوؤں کا کثیر حصہ ملازمت میں داخلہ کی غرض سے تعلیم سے خود کو مستغنی سمجھتا ہے ورنہ حکومت کی طرف سے تعلیم اور ملازمت کا دروازہ تمام رعایا پر بلا قید مذہب و ملت کھولا ہوا ہے۔ اگر سنت جی اس حقیقت حال پر غور فرماتے تو ایسے لاعلاج دماغی مرض میں مبتلا نہ ہوتے۔

سرکاری ملازمت پر ملکی زبان کا اثر صوبہ مدراس کی آبادی میں صرف ۲۲ فی صدی مسلمان اور ۸۸ فی صدی ہندو شامل ہیں۔ ہندو اور مسلمانوں کی عام تعلیمی حالت کا مقابلہ کرنے سے پایا جاتا ہے کہ فی ہزار ۱۷۴ مسلمان خواندہ ہیں اور ہندو تعداد میں ۱۵۰ فی ہزار تعلیم یافتہ ہیں لیکن مدراس کی گورنمنٹ کے ماتحت ملازمتوں میں ہندو مسلمان کا تناسب اُن کی عام تعلیمی حالت کے لحاظ سے بالکل جداگانہ ہے کیونکہ وہاں کی عدالتی اور دفتری زبان انگریزی ہے اور مسلمان اس سے نابلد ہیں اس لیے وہ ملازمت سرکاری میں بہت کم ہیں۔ حیدرآباد میں سرکاری زبان اُردو ہے اور اس زبان کو نہ سیکھنے والا قدرتی طور پر نقصان میں رہتا ہے۔

حیدرآباد نے اُردو کی سرپرستی کیوں کی اُردو وہ زبان ہے جس نے ہمیشہ خیالی قلمرو سے آزادی کا دلچسپ حاصل کر کے ملک کی عام زبان بن گئی اور ہندو مسلم اہل وطن نے متفقہ اس کا لٹریچر مرتب کیا۔ ہندوستان کی تہذیب روایات اور ملکی

طریقۂ معاشرت سے آگاہی حاصل کرنے اور سوسائٹی میں داخل ہونے کے لیے
انگریزوں کو بھی اردو سیکھنی پڑی اور چند ہی روز میں یہ زبان تمام ہندوستان
میں رائج ہو گئی جب تک کسی ملک میں قومی زبان نہ ہو وہ ترقی کی معراج
کمال تک نہیں پہنچ سکتا۔ جاپان اسی واسطے مہذب ملکوں کا ہم زانو ہے کہ وہاں
تمام علوم فنون مادری زبان میں پڑھائے جاتے ہیں۔ یونان کی دانش آرائی کی
بنا یہ تھی کہ وہاں سقراط، ارسطو، افلاطون وغیرہ نے قومی زبان میں تعلیم دینے
کے فتوے صادر کیے تھے۔ مصر کو تاریخی دنیا میں اسی لیے فروغ حاصل ہوا کہ اس
کے تمام علوم قومی زبان میں محفوظ تھے۔ ایران کے اقبال کا پرچم بھی قومی زبان
کے وسیلے سے لہرایا۔ ایشیا کے مشہور اور قدیم ملک چین نے دنیا میں اپنی خاص
زبان کی بدولت صنعتی جہانگیری حاصل کی اور کئی نقشوں سے دنیا کو سیاہی کا شیشہ
بتایا۔ عموماً بغداد، کوفہ، بصرہ، قرطبہ، غرناطہ کی علمی ... خصوصاً دہلی کا گزشتہ
اقبال زبان کی ترقی پر منحصر تھا۔ ۱۸۸۴ء میں آصف جاہ سادس نے اپنی
مملکت میں فارسی کی جگہ اردو زبان کو سرکاری زبان قرار دیا کیونکہ اردو اس
زمانہ میں ملک کی عام زبان ہونے کی صلاحیت حاصل کر چکی تھی۔ برادرانِ وطن
اپنی غلط فہمی سے اردو کو مسلمانوں کی زبان سمجھتے ہیں اور تنگ دل اور متعصب
لوگ اس کی مخالفت کرتے ہیں۔ اس زبردست مخالفت کے ہوتے ہوئے بھی
وہ برابر نشوونما سے ترقی کے مدارج طے کر رہی ہے جو مسلمانوں سے زبان اردو
علوم کے ساتھ کبھی ایسے بخل کو روا نہیں رکھا ہے جس کا ہندوستان کی مشترکہ
قومیت پر بڑا گہرا اثر پڑا ہے۔ اسلامی عہد میں سنسکرت اور بھاشا کی تصنیفات

ترشحے ہوتے رہے۔ بھاشا کی زبان کے پہلے شاعر حضرت امیر خسرو دہلوی ہیں۔
سلطنت مغلیہ کے مشہور شاعر مسعود بیگ، سلیمان، ملک محمد جائسی، عبدالرحیم خان
خاناں، خواصی، ملا نوری، شیخ شاہ محب الشان، آزاد بلگرامی، سید رحمت اللہ
وغیرہ۔ یہ سب وہ بزرگوار تھے جنہوں نے ہندی بھاشا میں اپنا زور قلم دکھایا
اور اپنی اسی آزادی کی وجہ سے ہندوؤں کے سوشل نظام اور ان کے تمدن کو
اس وقت تک زندہ رکھا اور پریم پرکاش جیسی کتابیں آج تک ہندوؤں کے
کتب خانوں میں موجود ہیں۔ یہ ہیں مسلمانوں کے علمی کارنامے جن کی وجہ سے یورپ
کے منصف مزاج مورخوں کو یہ کہنا پڑا ہے کہ اتفاقاً عالم میں مسلمانوں سے
زیادہ کوئی دوسری قوم نے تعصب اور ظلم وحشت نہیں ہوئی۔ دکن کی
سرزمین سے اردو کی سب سے پہلی شعاع روشن ہوئی ہے جس کی وجہ
سے وہاں کے کاروبار میں اس زبان کو قانونی طور پر دخل ہے اور وہاں
مسلمان ہندوؤں کے مقابلہ میں اس زبان کے خواص و رموز سے بخوبی
واقف ہیں۔ سول سروس والے امتحان میں ہندوؤں کی کامیابی اور اردو زبان
پر عدم توجہی کے دو سبب قرار دیئے جا سکتے ہیں۔ پہلا سبب تو یہ ہے کہ آج کل
شمالی ہندوستان میں برادران وطن نے اس بات کو اپنا فرض سمجھ لیا ہے
کہ وہ اردو کو جو ہندو مسلم اتحاد کی تاریخی یادگار ہے مٹا کر دقیانوسی اور دیوتاؤں
کی مردہ زبان کو زندہ کریں چنانچہ اردو کی عالمگیر طاقت کو فنا کرنے کے واسطے
نئی نئی تدبیریں کی جا رہی ہیں اور ایک مشترکہ زبان کو صرف مسلمانوں کی زبان
قرار دیکر ہندوستان کی قومیت کو بہت پیچھے ہٹایا جا رہا ہے۔ ہندو ریاستوں

برکتوں میں اپنے خوشنما مستقبل کا جلوہ دیکھ رہے ہیں۔ ایک فلسفی کا قول ہے کہ انسانی
زندگی کے بعض لمحے برسوں سے زیادہ قیمتی ہوتے ہیں۔ ایک چھوٹا سا لمحہ ایسا ہوتا
ہے کہ اس میں زندگی کے نہایت اہم مقاصد کی تکمیل ہو جاتی ہے" حیدرآبادی مسلمان اس
مبارک دن کے انتظار میں چشم براہ ہیں جس کی نورانی صبح اپنی زریں شعاعوں سے تیرہ
و تاریک اندھیرے کو دور کر دے گی کوئی جماعت اس وقت تک اپنی خواہشوں کو
مکمل نہیں کر سکتی جب تک اس کی مالی حالت درست نہ ہو جائے۔ صنعت و
حرفت۔ تجارت۔ زراعت نے ان قوموں کو دولت مند اور مرفہ الحال بنا دیا ہے
جو گزشتہ صدی میں کوئی تاریخی درجہ نہ رکھتی تھیں۔ مسلمان نہ تجارت اور
صنعت و حرفت میں ہندو کی برابر ہوئے ہیں اور نہ انھوں نے زراعتی شاخ
میں کوئی نمایاں ترقی کی ہے۔ دکنی زمینوں کی کاشت ۹۰ فی صد ہندوؤں کے
ہاتھ میں ہے۔ جاگیریں بلا تفریق مذہب ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کو دی جاتی
ہیں جن کی مجموعی تعداد ۱۱۹۰ ہے مگر سنت جی کے خیال میں جس طرح بڑے
جانور چھوٹے جانوروں کو نگل جاتے ہیں اسی طرح مسلمان ہندوؤں کو مرغی اور
مچھلی سمجھ کر ہضم کر رہے ہیں۔ دکن کی تاریخ شاہد ہے کہ مسلمانوں نے فاتح ہونے
پر ہندوؤں کو ان کے گھر سے نہ ہٹایا اور وہ اسی طرح کاشت میں مشغول ہیں
جیسے مسلمانوں کی آمد سے پیشتر تھے۔ شاہان دکن میں علاء الدین حسن گنگو ہی سے
جو خاندان بہمن کا پہلا بادشاہ گزرا ہے گنگو نامی برہمن سے وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ
برسر حکومت ہو جائے تو اپنے نام کے ساتھ گنگو کا لقب اختیار کرے گا علاء الدین
نے حکمرانی کے وقت اس وعدہ کو پورا کیا اور خاندان بہمنیہ کی حکومت کے وقت

سے اب تک اس ریاست میں برہمنوں کی قدر افزائی ہوتی رہتی ہے ملازمت
کے صیغہ میں اب تک برہمنوں کا اثر موجود ہے۔ ہندو مسلم کی مالی حالت کا مقابلہ
کیا جائے تو مرفہ الحالی اور تمول کا طرۂ امتیاز ہندو کاشتکاروں اور مہاجنوں
کے سر رہتا ہے اس کی بڑی وجہ یہی ہے کہ متوسط الحال مسلمان ملازمت کے چکر
میں پھنسے ہوئے ہیں اور دیگر پیشے ہندوؤں کے ہاتھ میں ہیں۔ میں نے حیدرآباد
کے زمانہ قیام میں اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ دارالسلطنت میں ۹۰ فی صد تاجر
ہندو ہیں گردوپیش کے واقعات دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ اضلاع میں
تقریباً ۹۹ فی صد تاجر ہندو ہیں۔ مجھے اخبار نویس ہونے کی حیثیت سے ہر ایک
طبقے سے ملنے جلنے اور ملاقات کرنے کا موقعہ ملا ہے۔ میں نے وہاں کے ساہوکار
ہنود کی حالت کو ان بڑے بڑے مسلمانوں سے بہتر پایا جو عہدہ دار ہیں اور بڑی
بڑی تنخواہیں پاتے ہیں۔ تمام ریاست میں ساہوکاروں کی تعداد ۶۱۷ کے
قریب ہے جن میں سے ۵۹۶ ہندو ہیں اور صرف ۲۱ مسلمان ہیں جن مسلمانوں
کے قبضہ میں زمینیں ہیں وہ زراعت کے اصول سے ناواقف ہیں اس
لیے بطور خود کام نہیں کرتے اور مالک آراضی کی حیثیت سے کاشتکاروں کو
اصلی منافع ملنے کا موقع دیتے ہیں۔ پٹہ داری اور کاشتکاری پر ہندو قابض
ہیں جس طرح مسلمان صنعت و حرفت میں کورے ہیں انھیں کاشتکاری سے
بھی مس نہیں معلوم ہوتا۔ گو مسلمانوں کی جماعت میں موجودہ عہد کی برکتوں سے
کسی قدر روشنی پھیل گئی ہے مگر ان میں ابھی ایسے اشخاص کی کمی نہیں ہے جو تجارت
کو معیوب سمجھا اور کسی تجارتی کمپنی میں شریک ہونا اپنی شان کے خلاف تصور کرتے

ہوں۔ اعلیٰ حضرت کی دلی تمنا یہ ہے کہ مسلمان ہر شعبہ میں ترقی کریں لیکن ہندوستان
کے دوسرے مسلمانوں کی طرح ابھی ان کی علمی زندگی میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہوئی
ہے۔ مسلمانوں کی تعلیم سے حضور نظام کی ہمدردی اور دلچسپی کے یہ معنی نہیں کہ دوسری
ہمسایہ قومیں علمی میدان کی دوڑ میں ان کی ہم قدم نہ بن سکیں بلکہ اس کی
بڑی وجہ یہ ہے کہ حضور کے نزدیک ایک ایسی قوم کو جو درماندہ ہو اُبھارنا فرائض
حکمرانی میں داخل ہے۔ صوبجات متحدہ آگرہ و اودھ میں ہندو تعلیم یافتوں کی کثرت
اور مسلمانوں کی تعلیمی حالت کو خراب دیکھ کر جناب لارڈ میسٹن صاحب بہادر
سابق لفٹننٹ گورنر نے مسلمانوں کے واسطے خاص مدارس و مکاتب کی اسکیم
جاری کی تھی۔ سیاسی نقطۂ خیال سے ایک یورپین حکمران کی نگاہ میں ہندو اور
مسلمان دونوں مساوی تھے مگر جب اُس نے ایک قوم کو تعلیمی حیثیت سے درماندہ
دیکھا اور اُس کی مشکلات کا اندازہ کیا تو اس کو خاص امداد دینے کا انتظام کرنا
پڑا۔ اسی طرح حضور نظام کا مسلمانوں کی تعلیم پر خاص توجہ فرمانا تعصب کی دلیل
نہیں بلکہ یہ الطاف آئین ریاست کا جزو اعظم ہے۔ وہ زمانہ دور نہیں ہے کہ
جامعہ عثمانیہ اور دکن کی دیگر درسگاہوں سے ایسے طالب علم نکلیں جو اپنی دماغی تخیلات
کے ذریعہ تمام ہندوستان کو فائدہ پہونچا سکیں۔ موجودہ نظام کی فرماں روائی
تمام باشندگان دکن کے لئے (خواہ وہ ہندو ہوں، مسلمان ہوں، پارسی ہوں
عیسائی ہوں) ابر رحمت سے کم نہیں ہے۔ مسلمانوں کی غفلت ہے کہ وہ
موجیں مارنے والے دریا میں اپنی مراد کا موتی نہ ڈھونڈیں اور اس قیمتی زمانہ
سے فائدہ نہ اُٹھائیں۔ لیکن افسوس کہ مسلمان جیسا فرشتہ رفتہ کی تصویر بنا

جو تو اس کے چہرہ کو اول سے ڈھانک دیتا ہے اور اس کے پاؤں میں پنکھ
دیتا ہے۔ چہرہ پر بال نشاطات کی وجہ سے ہیں کہ جس وقت وہ گزرتا ہے کسی کے سامنے
آئے تو وہ اگلی زلف ہاتھ سے پکڑ لے جیسے گزر جائے گا تو ہاتھ نہ آئے گا کیونکہ اس کے
پیچھے پکڑنے کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ پاؤں میں پر لگانے کا باعث یہ ہے کہ وہ
بہت جلد چلا جاتا ہے اور اس طرح جاتا ہے کہ پھر دوبارہ واپس نہیں آتا۔ مسلمانوں
کو عہد موجودہ کو غنیمت خیال کر اس نادر موقع کو ہاتھ سے نہ دینا چاہیے اور تحصیل علم کے ساتھ ساتھ
مروجہ فنون کو بھی سیکھنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ صرف صیغہ ملازمت کو ذریعہ معاش
بنانے سے وہ ترقی یافتہ اقوام کی طرح دنیا میں ناموری و شہرت حاصل نہیں
کر سکتے۔ اگر مسلمان بجائے حصول ملازمت کا خیال چھوڑ کر علم کو علم سمجھ کر اس کے حصول کی
جدوجہد کرینگے تو عجب نہیں کہ مسلمانوں کے علمی اقبال کا ستارہ پھر طلوع
ہو کر حیدرآباد کی سرزمین پر جامع ازہر قرطبہ و غرناطہ جیسی درسگاہیں پیدا کر دے
اور زمانہ تاریخ کے اوراق کا دوبارہ پلٹ کر ان کی سوئی ہوئی روح کو
جگا دے۔ نہ صرف یہ قدیم علوم کا مرکز ہو بلکہ جدید علوم کی نشر و اشاعت کا ذریعہ بن
حیدرآباد کو آکسفورڈ اور کیمبرج کا ہمسر بنا دے۔ اور ہندوستان کے لنگوا فرنکا یعنی زبان
اردو کو یورپ کی دوسری مہذب زبانوں کی طرح دنیا میں علوم و فنون کا سرچشمہ
ثابت کر دے۔ اور سر عثمان علی خاں بہادر کا نام نامی علمی دنیا میں ہارون الرشید
اور مامون الرشید کے ناموں کے ساتھ لیا جائے۔

موجودہ فرماں روائے دکن کا نظام حکومت رعایا پروری و عدل گستری کے زریں کارنامے

موجودہ فرماں روائے دکن مغربی و مشرقی پالیٹکس سے باخبر

اور زمانہ کی رفتار سے بخوبی واقف ہیں۔ ریاست حیدرآباد کے دور حاضرہ نے شاہانِ مغلیہ کی یاد کو تازہ کر دیا ہے۔ اس وقت دولت آصفیہ میں تعلیم تجارت صنعت و حرفت کے متعلق جو کارنمایاں کیے جا رہے ہیں وہ نہایت قابل قدر ہیں اور اُس کی شہرت ہندوستان سے لیکر ولایت تک پہونچ گئی ہے سنہ ۱۹۲۱ء میں لندن کے مشہور اخبار پال مال گزٹ نے لکھا تھا کہ حضور نظام دکن کو بادشاہ بنا دیا جائے۔ جب مسلمانوں کی نگاہیں ہندوستان سے نکل کر ادھر اُدھر دوڑ رہی ہیں تو کیا وجہ ہے کہ ان کی سلطنت کے اندر کوئی ایسا مرکز نہ بنا دیا جائے جہاں وہ ٹھہر سکیں۔ امیر افغانستان کو ہز مجسٹی کا خطاب دیے جانے سے ان کا جو کچھ اعزاز ہوا اُس سے برطانیہ کے دشمنوں نے فائدہ اُٹھایا اور مسلمانوں کو افغانستان کی طرف ہجرت کرنے کی ترغیب دی اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی دلی خواہش یہ ہے کہ ان کی قوم میں سے کسی کو بادشاہ بنایا جائے ہندوستان میں کسی مسلمان حکمراں کے زیر تخت اتنی بڑی آبادی نہیں جس قدر حضور نظام کے ماتحت ہے۔ اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانہ ہی سے آپ برطانیہ کے یار وفادار کہلاتے ہیں اور یورپ کی جنگ میں آپ نے اعلیٰ خدمات انجام دیے ہیں۔ اسی زمانہ میں پال مال گزٹ کے اس مضمون کی تائید میں ہندوستان کے انگریزی اور اُردو اخبارات نے آواز اُٹھائی تھی۔ اور

عرصہ دراز تک اس مسئلے پر خامہ فرسائیاں کی گئی تھیں۔ دولت آصفیہ کی موجودہ وسعت دنیا کی اکثر سلطنتوں کے رقبہ سے زیادہ ہو اور اس کی سطح سمندر کی سطح سے بارہ سو فٹ سے ڈھائی ہزار فٹ تک بلند ہو۔ ایک سیاح جب اس کے شمالی اور مغربی حصوں کی شادابی کو دیکھتا ہو تو اعلیٰ حضرت کی رعایا نوازی کا اعتراف کرتے ہوئے موجودہ دور کو زمانۂ ماضی پر ترجیح دینی پڑتی ہو۔ پرانے زمانے میں دکن کے اندر ہیرے کی کانیں اپنے آغوش میں قیمتی جواہرات رکھتی تھیں لیکن موجودہ تاجدار دکن نے حیدرآباد کی پتھریلی زمین پر علم و عمل کے گوہر افشانیاں کی ہیں وہ ان معدنیات سے کہیں زیادہ قیمت رکھتی ہیں۔ اس ملک میں قدیم زمانہ سے روئے زمین کی تمام قومیں آباد ہیں۔ اعلیٰ حضرت کی دلی خواہش ہو کہ گونڈ بھیل وغیرہ جنگلی وحشی اقوام کو شائستہ اور مہذب بنایا جائے اور اسی کام کے واسطے معقول رقم خرچ کی جاتی ہو جس کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں۔

اعلیٰ حضرت میر عثمان علی خان خلد اللہ ملکہٗ اگست ۱۹۱۱ء میں تخت نشین ہوئے ہیں اور آپ کے زمانہ حکومت پر دکن کی رعایا عام طور سے طمانیت کا اظہار کر رہی ہو۔ گزشتہ بارہ سال میں اعلیٰ حضرت نے اپنے طرز عمل سے ثابت کر دیا ہو کہ رعایا کی آسودگی انصاف اور رواداری کے اوصاف تاج شاہی کی رونق کو دوبالا کر دیتے ہیں۔ حضور کی رواداری کی تازہ مثال اعلیٰ حضرت کا وہ فرمان ہو جو عید اضحیٰ کے موقعہ پر قربانی گاؤ کی ممانعت کے بارہ میں صادر ہوا ہو۔ کیا کوئی ہندو ریاست مسلمان رعایا کے ساتھ اس قسم کی رواداری کی مثال پیش کر سکتی ہو؟

حضورِ نظام کی علمی فیاضی

ہنوز صوبہ برار کی واپسی کا مسئلہ معرضِ التوا میں ہے مگر اعلیٰ حضرت علم دوست ہونے کی حیثیت سے وہاں کے باشندوں کے آج بھی مددگار ہیں۔ ۱۹۲۳ء میں بندگانِ عالی کی بارگاہ سے یہ حکم صادر ہوا تھا کہ طلبائے برار کو سرکاری خرچ پر ولایت بھیجنے کے لیے حیدرآبادی طلباء کی برابر سمجھا جائے اور ایشیائی اور یورپی اسکالرشپ کے متعلق وہی حق دیا جائے جو حیدرآباد کے طالب علموں کو حاصل ہے۔ کیا یہ علمی فیاضی سنت نہال سنگھ کے اس اعتراض کی تردید نہیں کرتی جس میں ہندو طلباء کو وظائف نہ دیے جانے کا رونا رویا گیا ہے؟

سوشل اصلاحیں

یوں تو دورِ عثمانیہ میں آئے دن سوشل اصلاحیں ہوتی رہتی ہیں اور اخلاقی امور کی بابت طرح طرح کے فرامین صادر ہوتے رہتے ہیں جن کو جمع کیے جانے سے ایک ضخیم جلد مرتب ہو سکتی ہے مگر شراب نوشی کے انسداد میں جو تدابیر عمل میں لائی گئی ہیں اُنھوں نے اس منحوس اور خراب رسم کو مٹا کر بے شمار دولت کا تحفظ کر دیا ہے۔ اسی اخبار ہندو نے جو آجکل دولت آصفیہ کے خلاف مضامین شائع کر رہا ہے ۱۹۲۳ء میں یہ جھوٹی خبر شائع کی تھی کہ گورنمنٹ آف انڈیا نے حضورِ نظام کو کامل امتناعِ شراب نوشی کی پالیسی پر عمل کرنے سے باز رکھا۔ مدراس گورنمنٹ کو اس کی تردید کرنی پڑی اور اس موقع پر نظام گورنمنٹ کی جانب سے ۴ ارمئی ۱۹۲۲ء کو ایک فرمان شائع ہوا جس کا مضمون حسبِ ذیل ہے:

"ریاست حیدرآباد کی پالیسی متعلق آبکاری کا منشا یہ ہے کہ ریاست کی طرف سے سخت نگرانی اور واحد اجارہ منشی عرقیات کی کشید گی اور نقل و حرکت پر قائم رہے۔ اور اتنا زیادہ محصول آبکاری لگایا جائے جو

نہ صرف الکحل کا استعمال پھیلنے کو روکے بلکہ شراب کے استعمال کو بھی گھٹائے اور اس طرح یہ اطمینان حاصل ہو کہ گورنمنٹ کی آمدنی لوگوں کے اخلاقی خرچ پر حاصل نہیں ہوتی۔ یہاں یہ بیان کرنا موجب دلچسپی ہوگا کہ اس پالیسی کے نتیجے کے طور پر الکحل کے استعمال میں ۵۰ فیصدی کی تخفیف ہو چکی ہے۔"

"تیاری و فروخت شراب کی کامل ممانعت ممکن نہیں کیونکہ اس سے صرف بڑے پیمانہ پر ناجائز کشیدگی کثرت کے ساتھ خانگی بھٹیاں قائم ہونے تک نوبت پہونچیگی جن کا پتہ لگانا اور مسدود کرنا مشکل ہوگا اس طرح کامل امتناع کا شراب خواری کی عادت کو بڑھانے کا اُلٹا اثر پڑیگا۔ کیونکہ تیاری شراب کو قابو میں رکھنا اور اُس کے استعمال کو روکنا سراسر ناممکن ہے۔ اور عرقیات کی تیاری اور تقسیم کو روشن خیالی کے ساتھ قابو میں رکھنے کی جس پالیسی کا حوالہ دیا گیا ہے اُس میں ریاست حیدرآباد کو گورنمنٹ ہند اور مقامی نظامت کی پوری واقفیت و تائید حاصل رہی ہے اور مذکورہ صدر مضمون کے اندر جو گمراہ کن بیانات کیے گئے ہیں ان کی میں قطعی طور پر تردید کرتا ہوں کہ حکومت انگریزی نے ریاست حیدرآباد کی آبکاری کی پالیسی کو تضعیف کرنے کے لیے کوئی بات نہیں کی ہے۔ یہ بیان کہ معاملے نے یہاں تک طول کھینچا ہے کہ انگریزی حکام نے حضور نظام سے یہ مطالبہ کیا کہ وہ اپنے حامی امتناع وزیر اعظم سر علی امام کو موقوف کردیں اور ایک اور شخص کو ان کے بجائے منتخب کریں جو انگریزی خواہشوں کا زیادہ خیال کرے گا بالکل بانی ہے اور یہ پیراگراف بھی ایسا ہی ہے جس میں وہ گمراہ کن بیان درج ہے۔ اخبار ہند کے ایڈیٹوریل کالموں میں مسٹر جانسٹن کے اُن نام نہاد حیرت انگیز انکشافات کی نسبت جو پیش کیے گئے ہیں اُن پر کسی رائے زنی کی ضرورت نہیں کیونکہ وہ غلط صغری و

وکبری پر مبنی ہیں ۔“

عدالتی اور انتظامی اختیارات کی علیحدگی

برٹش انڈیا میں جس اصلاح کی ضرورت تقریباً پون صدی سے محسوس کی جارہی ہے۔ ہز اگزالٹیڈ ہائی نس نے اس اسکیم کو عملی صورت دینے میں پیش قدمی فرمائی اور ۲۲ء ۱۹۲۱ء میں اس مضمون کا فرمان صادر فرمایا کہ عدالتی اور انتظامی اختیارات فوراً علحدہ کر دیئے جائیں۔ اس فرمان مبارک میں یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ اعلیٰ حضرت بندگان عالی نے یہ اصلاح اس یقین پر کی ہے کہ یہ تبدیلی ضرورت ملک کے انتظام میں بہتری کا سبب ہی نہوگی بلکہ رعایائے دکن کی فلاح و بہبودی اس سے وابستہ ہے۔

صنعت و حرفت کی ترقی

یوں تو ریاست میں ایک مستقل محکمہ صنعت و حرفت کا قائم ہے اور چھوٹی چھوٹی ملکی صنعتوں کو رواج اور ترقی دینے کے لیے کاریگروں کی مختلف طریقے سے مدد کی جاتی ہے۔ لیکن سالانہ نمائش کا انعقاد جو ہر سال سالگرہ مبارک کے موقعہ پر ہوتا ہے خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ مشرقی بادشاہوں راجوں نوابوں کی سالگرہ کے جشن کی تکمیل رقص و سرود اور اسی قسم کے دیگر کھیل تماشوں کے بغیر نہیں ہوا کرتی لیکن حضور شہریار دکن نے اس رسم کو توڑ دیا ہے اعلیٰ حضرت کی سال گرہ کے موقع پر ناچ رنگ اور دوسرے خلاف تہذیب امور کی ممانعت ہے۔ اور اس موقع پر صنعت و حرفت کی ترقی کو مد نظر رکھ کر ملکی مصنوعات کی نمائش نہایت اعلیٰ پیمانہ پر ترتیب دی جاتی ہے۔ ماہ گزشتہ میں اڑتیسویں سالگرہ کی تقریب میں یہ

نمائش پورے ایک ماہ تک قائم رہی تھی اور اسی زمانہ میں یہ فرمان مبارک جاری ہوا تھا کہ نمائش کے لیے ایک مستقل عمارت تیار کی جائے جس کے لیے ایک لاکھ روپیہ کی منظوری دی گئی تھی

ترقیات عامہ کی اسکیم

یہ اسکیم سابق صدر اعظم نے پیش کی تھی جس کی روسے اراضیات لاؤنی پر اُٹھائی جانے والی تھیں لیکن ابھی تک کوئی عملی کارروائی نہیں ہوئی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ جن شرائط پر زمینوں کا اُٹھانا قرار دیا گیا ہے وہ قابل عمل نہیں۔

بندگان عالی متعالی کی نظر دور بین نے فوراً اس کے نقائص کو تاڑ لیا اور یہ اسکیم معرض التوا میں پڑ گئی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو حکومت کو کروروں روپیہ کا نقصان برداشت کرنا پڑتا۔ اور اہل ملک کو بھی طرح طرح کی دقتوں کا سامنا ہوتا۔

سنت جی نے بھی اس اسکیم کا ذکر کیا ہے مگر اس کے نقائص دکھانے سے پہلو تہی کی ہے جس سے اُن کی جنبہ داری کا پتہ چلتا ہے۔ علامہ ابن خلدون نے واقعات نگاری کا فلسفہ بیان کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ "ذاتی حالت کو جب تک عارضی حالت سے جدا نہ کیا جائے واقعیت ظاہر نہیں ہوسکتی کیونکہ عوارض پر حکم لگانا ٹھیک نہیں ہے"

اسی طرح عدالتی اور انتظامی اختیارات کا ذکر کرتے ہوئے سنت جی نے اس کا مفید اور با نتیجہ ہونا ثابت کیا ہے اور اس اسکیم کا مصنف بھی سابق صدر اعظم صاحب کو بتایا ہے لیکن یہاں پر بھی ان کی تنگدلی اور تعصب نے اعلیٰ حضرت کی بیدا مغزی کی جنھوں نے بلا لحاظ قوم وملت عام رعایا کی بہبودی کو مدنظر رکھ کر اس کی منظوری

کا فرمان صادر فرمایا تعریف کرنے سے احتراز کیا۔ فارسی کا یہ مقولہ بالکل صحیح ہے ؎

ہنر بچشم عداوت بزرگتر عیبے است

سنت جی کے مضامین کا اثر دوسرے ہندو اخبارات پر

آخر میں ہم یہ بیان کرنا چاہتے ہیں کہ سنت نہال سنگھ نے اخبار ہندو بدر اس میں جو مضامین اس ریاست کے خلاف چھپوائے اور اس میں فرمان رو ائے دکن کے خلاف جو زہر اُگلا اُس کی ایک وجہ موجود تھی کہ اُن کو منہ مانگے ٹکے نہ ملے اور وہ خفا ہو گئے۔ لیکن بعض دوسرے آریہ اور ہندو اخبارات نے آنکھوں پر کیوں ٹھیکری رکھ لی ہے۔ اِدھر اخبار ہندو میں سنت جی کے مضامین کا نکلنا تھا کہ اخبار ملاپ ۔ نیشن ۔ سدھارک وغیرہ نے سلطنت آصفیہ اور اُس کے فرماں روا پہ زہر اُگلنا شروع کر دیا اور بالخصوص اخبار ہندو کے داخلہ ممالک محروسہ کی ممانعت کا فرمان دیکھ کر یہ متعصب اخبار تو بھی چراغ پا ہو گئے۔ آگرہ کا ایک ہندو اخبار "سدھارک" اس قدر از خود رفتہ ہوا کہ اُس نے اپنی یکم اکتوبر ۱۹۲۳ء کے ایشیو میں اس خبر کا عنوان "نظام کی بد . . . . ." قائم کیا۔ حضور نظام کے نام کے ساتھ ایک ایسے مکروہ لفظ کا لکھنا اسی اخبار کا کام ہو سکتا ہے۔ نیک معاشی کے برعکس اظہار خیال کے لیے وہ لفظ جس کو سدھارک نے حضور نظام کے ساتھ منسوب کر کے اپنے کمینہ جذبات کو پورا کیا ہے۔ شرفا کے حلقہ میں معمولی اشخاص کو خطاب کرتے وقت بھی نہیں بولا جانا چاہیے کہ ایک مقتدر روالی ملک کی شان میں ایسی گستاخی نہ معلوم گورنمنٹ صوبہ متحدہ کے

اراکین نے اخبار سدھارک آگرہ کے اس طرزِ عمل کو کس نظر سے دیکھا
اس قسم کی اخلاق سے گری ہوئی حرکات سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب دلوں میں
کدورت ہوتی ہے اور غصہ ہوتا ہے تو انسان کی عقل صحیح نہیں رہتی۔ شمالی ہند
میں سنگٹھن اور شدھی کی جو تحریک ہندوؤں میں پھیل رہی ہے اور جس نے تمام ملک میں
شورش پھیلا دی ہے۔ اُس نے ہندو پریس کو برافروختہ کر دیا ہے اسی لیے انھیں اب اسلامی ملک
کو جو لاکھوں ہندوؤں کا آقا اور ولی نعمت ہے بُرا کہنے میں پس و پیش نہیں ہوتا
لیکن اُن کو یاد رکھنا چاہیے کہ چاند پر خاک ڈالنے سے چاند نہیں چھپ سکتا اور
سلطنت آصفیہ کی ضرب المثل رواداری معدلت گستری اور رعایا
پروری کو رعایائے دکن خوب سمجھتی ہے وہ اپنے نادان دوستوں کی
اُن خدمات کی جو ریاست حیدرآباد پر ناواجب نکتہ چینی کی صورت میں یہ
لوگ انجام دے رہے ہیں داد نہیں دے سکتی اور اُن کو بے ساختہ کہنا پڑتا ہے
کہ خدا ہم کو ہمارے نادان دوستوں سے بچائے۔

خاکسار
نظامی - بدایونی
بدایوں ۲۵ اکتوبر ۱۹۲۳ء

تمام شد

مطبوعہ نظامی پریس بدایوں
یو - پی